الحق کے سوالنامہ کے جواب میں

سلسلہ ۱۴

اسلامی نصابِ تعلیم کے بنیادی نقاط

ڈاکٹر سید محمد یوسف صاحب
پروفیسر عربی، جامعہ کراچی

مکرمی! وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ ـــــ آپ کے سوالنامہ کا ہر سوال ایک مستقل عنوان ہے ایک موضوع جو سب سے زیادہ اہم ہے اس پر اپنے خیالات قلمبند کر دئے ہیں۔ امید ہے کہ اس سے آپ کی فرمائش کی تکمیل ہو جائے گی۔

مخلص ـــ محمد یوسف

آغازِ اسلام سے لے کر بارھویں صدی ہجری تک کتنے سیاسی انقلاب آئے، عالمِ اسلام کتنی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ گیا، خانہ جنگی بھی ہوئی، لیکن نصابِ تعلیم کی بابت جو تصور عام تھا وہ بدستور کوسنے میں یکساں طور پر واضح اور نمایاں رہا۔ تھوڑے عرصہ کے لئے فاطمیین نے مصر میں اپنے مخصوص عقائد کی تعلیم کا جو طریقہ رائج کیا وہ ایک اہم تبدیلی ضرور تھی۔ لیکن "لادینی" نہ تھی۔ نظام الملک کے عہد سے مشرق میں معقولات کو جو غلبہ حاصل ہوا اُسے محض "تطویر" کہنا چاہیئے جو اُس دور میں اس بات کی علامت تھی کہ اسلامی نصابِ تعلیم کی آغوش عصری علوم معقولہ دوخیلہ کے لئے کشادہ ہے۔ اکبر کے دور میں بے شک اسلامی نصابِ تعلیم کی بیخ کنی کی بھرپور کوشش ہوئی جو زیادہ عرصہ نہ چل سکی اور ناکام رہی۔ ملا عبدالقادر بدایونی اس دور کی بابت لکھتے ہیں: عربی خواندن و دانستن آں عیب شد و فقہ و تفسیر و حدیث و خواندہ آں مطعون و مردود ..... حکم شد کہ ہر قوم ترک علوم عربیہ نمودہ غیر از علوم غریبہ از نجوم و حساب و طب و فلسفہ نخوانند ـــــ" آخر میں ملا صاحب ان

روایات پہ نوحہ ختم کرتے ہیں:

مدارس از علما آں چناں بود خالی — کہ ماہِ روزہ زمے خانۂ خمار
برند تحفۂ دین ادیب از پئے نذر — کنند مصحف قاری گرو بجۂ قمار

اسلامی نظامِ تعلیم کے بنیادی نقاط کی نشاندہی کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی تاریخی دستاویز نہیں ہو سکتی۔ عربی زبان و ادب، تفسیر، حدیث و فقہ اسلامی نظامِ تعلیم کی روح ہے۔ اکبر کا مقصد ناپاک سہی اسکی سمجھ بالکل درست تھی۔ اس نے اسلامی نظامِ تعلیم کی روح سلب کرنے کی کوشش کی اور ناکام رہا۔ اکبر جو نہ کرسکا وہ میکالے نے کیا۔ تقریباً ڈیڑھ سو برس پہلے برصغیر کے نظامِ تعلیم میں جو تبدیلی آئی وہ بنیادی تھی۔ اسی کی بدولت ہماری فکر میں جو دوئی پیدا ہوئی، وہ آج ایک لاعلاج مرض بن گئی ہے۔ اسی کی بدولت ہماری سیاست میں انتشار اور کھوکھلے نعروں کے سوا کچھ باقی نہیں، ملی وحدت پارہ پارہ ہو چکی ہے۔

اکبر اور میکالے دونوں کا عمل راست تھا۔ وہ اسلامی نظامِ تعلیم کی روح سلب کرنا چاہتے تھے، ایک ناکام رہا، دوسرا شاذ کامیاب ہوا۔ یہ نہیں دونوں کھلے بندوں جانے پہچانے دشمن تھے دونوں کی بابت علماء کا جو اندازہ تھا تاریخ اسے درست ثابت کر چکی ہے۔ گذشتہ صدی کے علماء پر انگریزی زبان اور سائنس کے خلاف تعصب اور دشمنی کا جو الزام ہے اس کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ کسی صورت عربی زبان و ادب، تفسیر، حدیث، فقہ کو سودا کرنے پر تیار نہ تھے۔ اگر وہ یہ سودا کر لیتے اور اپنے طور پر عدیم المثال اخلاص اور ایثار کے ساتھ اس ورثے کو جو اسلامی نظامِ تعلیم کی روح ہے، باقی نہ رکھتے تو آج جو حال ہوتا اس کے تصور سے دل دہل جاتا ہے۔

مذکورہ بالا پس منظر میں دیکھئے: آج ہمارے یہاں دو متوازی نظامِ تعلیم رائج ہیں۔ ایک طرف مدارس عربیہ اسلامیہ ہیں دوسری طرف اسکول کالج اور یونیورسٹیاں ہیں۔ تحریکِ پاکستان اور قیامِ پاکستان سے جو نئے عوامل بروئے کار آئے ہیں ان کا تقاضا ہے کہ اس دوئی، بلکہ کہنا چاہیئے تضاد کو ختم کرکے متحد قومی اسلامی نظامِ تعلیم تشکیل دیا جائے۔ مدارس میں عربی، تفسیر، حدیث، فقہ ہے، انگریزی کالجوں یونیورسٹیوں میں انگریزی، جدید اجتماعی علوم اور سائنس ہے۔ کسی کو اس سے اختلاف نہیں کہ ان دو اجزاء کو باہم یکجا کر دیا جائے تو ایسا نظامِ تعلیم وجود میں آئے گا جو دین و دنیا دونوں میں ترقی و سربلندی کا ضامن ہوگا۔ دو اجزاء میں سے ایک جزو مدارس میں ہے۔ اور دوسرا میکالے کے رائج کردہ تعلیمی اداروں میں۔ انہیں یکجا کرنے کی دو صورتیں ہیں: ایک یہ کہ مدارس میں عربی تفسیر حدیث فقہ

کے ساتھ انگریزی، جدید عمرانی علوم اور سائنس کو جگہ دی جائے، دوسری یہ کہ اسکول کالج اور یونیورسٹیوں میں عربی تفسیر حدیث فقہ کو پورے نظام تعلیم کی روح کی حیثیت سے داخل کیا جائے۔ مدارس پر علماء کو اقتدار اور خود مختاری حاصل ہے۔ اور بجا طور پر حاصل ہے۔ اس لئے کہ اگرچہ عموماً وہ بانی دار العلوم دیوبند کی وصیت[1] کے خلاف امیروں کی شرکت اور سیٹھوں کے بڑے بڑے عطیات پر تکیہ کرنے لگے ہیں۔ پھر بھی حکومت کی مالی امداد سے بے نیاز ہیں۔ فرض کیجئے کہ دانائے دین جمود کا شکار ہیں، جدید علوم کی قدر نہیں جانتے تو (یہ کیا ہے کہ ہر کس و ناکس علماء کا ناصح بن کر مدارس کی اصلاح پر تلا ہوا ہے۔؟ یہ ناصح بیک جنبش قلم دوسری صورت کو عملی جامہ پہنا سکتے ہیں۔ اسکول کالج اور یونیورسٹیاں تو تمام تر روشن خیالوں کے قبضۂ قدرت اور تصرف میں ہیں۔ وہ تو زمانے کے تقاضوں کو، بلکہ یوں کہئے کہ ہوا کے رخ کو پہچاننے میں مہارت رکھتے ہیں۔ وہ میکالے کے نظام کی اصلاح کے لئے کیا کر رہے ہیں۔؟] کاش وہ کچھ نہ کرتے۔ لیکن انہیں اپنا اقتدار برقرار رکھنے کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا ہے۔ وہ کر رہے ہیں۔ اور جو میکالے سے نہ ہو سکا۔ وہ کر رہے ہیں۔ علماء جو نہیں کرتے وہ تو سب کو معلوم ہے۔ اور یہ جو کرتے ہیں اس کی حقیقت کا کسی کو اندازہ نہیں، "سادگی مسلم کی دیکھ" علماء نے بھی یہ غور کرنے کی زحمت نہ کی کہ جو ہو رہا ہے اس کے مضمرات کیا ہیں۔

اکبر اور میکالے نے راست حملہ کر کے اسلامی نظام تعلیم کی روح سلب کی، اب سیاسی مصلحت راست حملہ کی اجازت نہیں دیتی اس لئے میکالے کی طریقت کے سالک اسلام کی روح سلب کرنے

---

[1] مولانا محمد قاسم کی تحریر کردہ ایک اصل: "سرکار کی شرکت اور امراء کی شرکت بھی زیادہ مضر ہوتی ہے۔" مولانا کی تاکید تھی کہ دار العلوم کا تعلق عام مسلمانوں کے ساتھ زائد سے زائد ہو تاکہ یہ تعلق خود بخود مسلمانوں میں ایک نظم پیدا کر دے..... افسوس آج یہ تعلق صرف قربانی کی کھالوں میں سمٹ کر رہ گیا ہے۔

مولانا فضل الرحمٰن نے اسی کو یوں نظم کیا تھا:

اسکے بانی کی وصیت ہے کہ جب اس کیلئے کوئی سرمایہ بھروسہ کا ذرا ہو جائے گا
پھر یہ قندیل معلق اور توکل کا چراغ یہ سمجھ لینا کہ بے نور و ضیا ہو جائے گا

اس کے مقابلہ میں سر سید کا علی گڑھ سرکار کی شرکت اور امراء کی شرکت پر قائم ہوا لیکن وہاں سے بھی عام مسلمانوں سے تعلق رکھنے کی غرض سے ہر سال اساتذہ و طلبہ کے وفود ملک کے طول و عرض میں بھیجے جاتے تھے۔ عرصہ تک علی گڑھ ایک عوامی قومی تحریک کا نام تھا۔ آج علی گڑھ بھی محض ایک یونیورسٹی ہے۔

کی بجائے اسلام کی روح مسخ کر رہے ہیں۔ ایوب کے دور کا سب سے گھناؤنا عمل یہ تھا کہ نام نہاد ماہرین تعلیم میں سے ایک دو کو اسلام، اسلامی تعلیم اور سب سے بڑھ کر اسلامی تحقیق اور ریسرچ کا ٹھیکہ دے دیا گیا۔ ان ٹھیکہ داروں نے عربی اسلامی علوم کے جہل تام کے باوجود جس ڈھٹائی کا مظاہرہ کیا وہ صرف ایک ضمیر فروش ہی کر سکتا ہے۔ انہوں نے ایک نئی اسلامیات ایجاد کی جس میں ہو بہو اکبر کی تقلید کرتے ہوئے "عربی خواندن و دانستن آں عیب شد" جیسے یقین نہ آئے وہ ہماری یونیورسٹیوں کے اسلامیات کے نصاب کو ذرا غور سے پڑھ لے۔ اس اسلامیات میں قرآن و حدیث کی بجائے چند آیات و احادیث کا اردو ترجمہ پڑھایا جانے لگا۔ اور رائج الوقت نظریات میں سے کسی کے ساتھ "اسلامی" اور کسی کے ساتھ "غیر اسلامی" کا سابقہ لگا کر انگریزی اور اردو میں اسلامی تعلیمات اور اسلامی نظریۂ حیات کا سراسر غیر علمی غیر مستند من مانا چوں چوں کا مربّی تیار کیا گیا۔ اس نظریۂ حیات نے علم فقہ و شریعت کے مطالعہ کی صبر آزما کاوش سے نجات دلا دی۔ میکالے کے نظام تعلیم کو اسلامیانے کا یہ کارنامہ آج بھی اسکول کالج اور یونیورسٹیوں میں عربی اسلامی علوم کے تقدس کا مضحکہ اڑا رہا ہے۔

یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ جو بڑھ بڑھ کر علماء کو مدارس کی اصلاح کی نصیحت کرتے ہیں وہ اسکول کالج اور یونیورسٹیوں میں عربی زبان و ادب، تفسیر حدیث اور فقہ کو نصاب تعلیم کی روح اور اس کے محور کا درجہ دینے کے لئے تیار نہیں۔ وہ جو کچھ کر رہے ہیں۔ اس کا مقصد اور واقعی نتیجہ یہ ہے کہ عربی اسلامی علوم کی علمی قدر اور ان میں اختصاص کی اہمیت اور ضرورت ہی باقی نہ رہے۔ چنانچہ یونیورسٹیوں میں جب اسلامی علوم سے متعلق کوئی تجویز زیر غور ہوتی ہے۔ تو سائنسدانوں اور ایسے ہی بے بہرہ حضرات اس شد و مد سے بولتے ہیں۔ گویا اسلامی علوم ان کے گھر کی لونڈی ہے۔ غیرت مند بیٹے سوچتے رہ جاتے ہیں کہ کیا یہ ممکن ہے کہ سائنس سے متعلق کسی کمیٹی کی ممبری ایک اسلامی علوم کے ماہر کو نصیب ہو سائنس تجربی علم ہے جو مخصوص مزاج اور اخلاق کی تربیت کرتا ہے۔ ان میں سرفہرست علمی دیانتداری ہے۔ جب سائنسدان کسی ایسے موضوع میں دخل دے جس کا اسے "علم" نہ ہو تو اس کی سائنس میں شک

لہ ایسی ہی اسلامک ایڈوائزری کونسل پر ہمارے علماء رضامند نظر آتے ہیں۔ دینی حلقوں میں جو تبصرے ہوئے ان میں صرف اتنا ہے کہ علماء کی تعداد بڑھا دی جائے، باقی اسلامی علوم کے جاہل بڑے بڑے دنیوی مناصب کا غرور لئے بیٹھے رہیں تو مضائقہ نہیں۔ اسے مایوسی کہئے یا سیاسی مجاملت بہرحال ذاک اول الوهن۔

ہونے لگتا ہے۔ سائنس اتنی تنگ نظر تو نہیں کہ ایک سائنس دان اورنٹیل کالج لاہور بند کرانے کی مہم چلائے، دوسرا سائنسدان تمام آرٹس کے شعبوں میں تالہ ڈالنے کی سوچے، اور جب سائنس کی تعلیم پر کروڑوں روپیہ خرچ کرنے کے بعد نتیجہ مایوس کن ہو تو یہ کہا جائے کہ آرٹس کی تعلیم اور ادبی اور انسانی علوم "بے مقصد" ہیں۔ جب تک ان کا وجود باقی ہے سائنس صنعت و حرفت ترقی نہیں کر سکتی، ہر شخص کو سائنس پڑھایئے یہ تو چنگیزی سے بھی بڑھ کر ہے۔ اسلامی علوم کو ایسے دوست ملیں تو دشمن ان کا اُسامہ کیوں ہو، ایوب کے معتمد علیہ ماہر تعلیم ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی بھی، بہ شہادت جماعت اسلامی، اسلام کے بڑے دوست اور محافظ تھے لیکن عربی اسلامی علوم سے وہ بھی بہت ڈرتے تھے، انہوں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اسلامی علوم کو عربی زبان و ادب کی قید سے رہائی دلائیں گے۔ چنانچہ جب وہ عربی سے معرّی اسلامیات ایجاد کر چکے تو بولے کہ اگر عربی، فارسی اور ترکی تینوں زبانوں کے اسلامی ادب کو ایک پلڑے میں رکھا جائے۔ اور اردو کے اسلامی ادب کو دوسرے پلڑے میں تو اردو کا پلڑا بھاری رہے گا۔ یہ کسی صوفی کے شطحات نہیں ہیں۔ یہ وہی اکبر کا دستور (عربی خواندن و دانستن آں عیب) ہے جسے مغرب کی عطا کردہ زیرکی نے بیسویں صدی کی زبان میں ادا کیا ہے۔ پہلے روشن خیالوں کی محفل میں عربی اسلامی علوم کا داخلہ ممنوع تھا، اب محفل کے اندر بلا کر ان کی تضحیک کی جاتی ہے۔ اور اردو کو اشارہ ہوتا ہے کہ وہ عربی کو منہ چڑائے۔

جہاں تک عربی مدارس کی اصلاح کا تعلق ہے، نصاب تعلیم کوئی جامد چیز نہیں کہ علوم و فنون کی ترقی کے ساتھ اس میں تبدیلی نہ ہو۔ آپ دیکھیں عرصہ سے عربی زبان و ادب کی تعلیم خود عربی مدارس میں بے جان ہو کر رہ گئی ہے۔ مجموعی نصاب میں عربی زبان کی غرض و غایت صرف اتنی ہے کہ عربی کے متون سمجھنے پر قدرت ہو جائے۔ عربی ادب کا کوئی اہتمام نہیں۔ عربی میں تقریر و تحریر کا رواج ہی نہیں رہا۔ الّا ماشاء اللہ۔ علماء نے بھی عربی چھوڑ اردو کو تصنیف و تالیف کا ذریعہ بنایا۔ یہاں تک میرا تجربہ ہے کہ بعض علماء عربی زبان کی فضیلت کے بارے میں امام شافعیؒ اور ابن تیمیہ کی صراحت کی بجائے بیسویں صدی کے قوم پرستوں کی طرح گول مول بات کرنے لگے تھے۔ اس کا سبب ظاہر ہے کہ استعمار نے ہمارے اور عرب ممالک کے مابین کوئی تعلیمی ثقافتی رابطہ باقی نہ چھوڑا۔ قیام پاکستان کے بعد سے ہماری حکومتوں کی سرد مہری کے باوجود عرب ممالک سے کچھ نہ کچھ روابط پیدا ہوئے، جس کے نتیجہ میں اب مدارس میں عربی زبان کی تعلیم کو بہتر اور مفید بنانے کی کوشش جاری ہے۔ کراچی کے ایک دو مدرسے اس لحاظ سے ممتاز ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ اس کے بعد دوسرا قدم ادبی ذوق کی تربیت ہوگا۔ تفسیر حدیث فقہ کا جو مقام ہمیشہ سے ہے وہ ہمیشہ رہے گا۔ البتہ اگر فقہ کے غلبہ سے تفسیر حدیث کی حق تلفی ہوتی ہو تو اس کی تلافی ضروری ہے۔

اب رہ جاتی ہے بات منطق فلسفہ و کلام کی۔ منطق کو فرسودہ نہیں کہا جاسکتا۔ وہی یونانی منطق جو مدارس میں پڑھائی جاتی ہے۔ آج بھی بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ منطق میں اگر کوئی چیز جدید ہے تو طریقۂ تعلیم یا تشریحات و تفصیلات۔ اگر اصل یونان سے درآمد ہوسکتی ہے۔ تو اس میں اضافہ اور تعدیل قبول کرنے میں کیا قدغن ہے۔؟ جیسا آگے آئے گا۔ واقفیت شرط ہے۔ فلسفہ بھی یونان سے آیا اور اس کے رد کے لئے علم کلام کی ضرورت پڑی۔ اس میں شک نہیں کہ فلسفہ صدیوں کی بحث و تمحیص کے بعد بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہر زمانہ کا ایک مزاج ہوتا ہے۔ جو مسائل اس وقت جاذبِ توجہ تھے اور مسلمانوں میں انتشارِ فکری کا سبب بنے ہوئے تھے۔ اور جن کا رد کلام میں پایا جاتا ہے۔ ان کی حیثیت آج محض تاریخی رہ گئی ہے۔ اگر مختصر تاریخ کے طور پہ پڑھایا جائے تو ٹھیک ہے۔ ورنہ تضییعِ اوقات ہے اس لئے کہ دورِ حاضر کے مسائل سے اس کا ذرا بھی ربط نہیں۔ مثلاً آج کے مسائل علمانیت (لادینیت) انکارِ ختم نبوت، انکارِ حدیث، قوم پرستی ہیں۔ اگر ان کی بابت نیا علم کلام ترتیب دیا جائے، اور یہ ذرا سی توجہ اور کوشش سے ممکن ہے، تو کہیں زیادہ مفید اور دلچسپ ہوگا۔ پھر ہر ایک کے لئے فلسفہ و کلام کے درس کا لزوم بھی محلِ نظر ہے۔ یہ یاد رہے کہ حضرت گنگوہیؒ کی رائے نہ تھی کہ دارالعلوم دیوبند میں فلسفہ اور منطق کا درس ہو۔ ایک مرتبہ تعمیلِ ارشاد کے لئے یہ دونوں فن خارج کر دئے گئے لیکن پھر ارکانِ شوریٰ نے کچھ عرصہ بعد ان دونوں فنون کو داخلِ نصاب کر دیا۔

مولانا جمیل الدین صاحب سابق رکن دارالعلوم سے منقول ہے کہ حضرت گنگوہیؒ نے خواب دیکھا کہ دارالعلوم کی اس عمارت میں جس کو نودرہ کہتے ہیں، ایک اجتماع ہو رہا ہے۔ رسول اللہؐ رونق افروز ہیں۔ آپ کی نظر ایک کتے پر پڑی جو نودرہ کے سامنے صحن میں بیٹھا ہوا ہے۔ حکم ہوا اس کتے کو نکال دیا جائے۔ حضرت گنگوہیؒ نے منطق اور فلسفہ کو کتے کی تعبیر تصور کیا۔ (سید محمد میاں: علماءِ حق جلد اوّل ص ۵۸) بہرحال یہ تو کوئی بھی نہیں کہے گا کہ منطق و فلسفہ کا درس دین کے لوازم میں ہے یا اس کا اخراج دینی نقطۂ نظر سے محلِ اعتراض ہے۔ زمانے کی ضرورت اور مصلحت کی بات ہے۔ ندوہ کے بانیوں نے بھی اس مسئلہ پر اسی حیثیت سے سوچا تھا۔

ہیئت کے متعلق پورے وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ خالصتہً تجربی علم ہے، جو کچھ مدارس میں پڑھایا جاتا ہے وہ محض عقل کی پیداوار ہے۔ (جو اس کا رشتہ وحی سے جوڑے وہ اسلام کا نادان دوست ہے۔) عقل کی ترقی جو نظامِ کائنات سے متعلق تجربہ اور مشاہدہ پہ مبنی ہو، بالکل فطری اور واجب التعلیم ہے۔ گذشتہ صدیوں میں عقل نے جو ترقی کی منزلیں طے کی ہیں۔ ان سے سابقہ نظریات کا بطلان ثابت

ہو چکا ہے۔ اب مدارس میں ان باطل یونانی نظریات کو پڑھانا عقل کے لئے گمراہی کا باعث ہے۔ یہی حال طب کا ہے۔ طب یونانی کو مسلمانوں نے اپنے تجربات و مشاہدات سے فروغ دیا۔ اب جو اسے حرف آخر سمجھے گا، نئے انکشافات سے بے خبر رہے گا۔ اور جھجکے گا۔ وہ پیچھے رہ جائے گا۔ اور دوسرے آگے بڑھ جائیں گے۔

علوم دنیا تمام تر عقل کی کاوش کا نتیجہ ہیں، وحی سے ان کا تعلق نہیں، جو علوم دخیلہ اس وقت مدارس کے نصاب میں شامل ہیں۔ ان میں کمی اور ردّ و بدل عقل کی صوابدید پر چھوڑ دینا چاہیئے ——— "ہر دم متغیر ہیں خرد کے نظریات" عقل کا اپنے سابقہ نظریات کو باطل قرار دینا کوئی عجیب بات نہیں اس سے کوئی دینی یا اخلاقی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے برخلاف علوم نقلیہ، جن کی بنیاد وحی پر ہے، ان میں بحث و تمحیص سے ترقی ہوتی ہے، تغیر و تبدل کا امکان ہی نہیں۔ اسی لئے عربی زبان و ادب، تفسیر حدیث فقہ کو ان کی جگہ سے ہٹانا یا کسی حال میں بھی کسی بھی نظام تعلیم میں ان کو جگہ نہ دینا دین سے بے وفائی ہے۔ بعض علوم دخیلہ ایسے ہیں جو اس وقت نصاب میں شامل نہیں ہیں۔ لیکن ان کیلئے نصاب میں جگہ نکالنا ضروری ہو گیا ہے۔ ان میں سر فہرست انگریزی زبان ہے۔ اگر مدارس میں انگریزی کی تعلیم کا خاطر خواہ انتظام ہو تو قدیم اور جدید کے درمیان تلفیق آسانی سے پائی جا سکتی ہے۔ جدید سے چشم پوشی ناممکن ہے۔ اگر جدید فلسفہ کا علم ہو تو اس سے قدیم کی تنقیح ہوتی ہے۔ اس سے جدید میں رد و قدح کا دروازہ کھلتا ہے، جس کے نتیجہ میں ایک متوازن فکر جنم لیتی ہے۔ اگر انگریزی زبان پر عبور ہو تو جدید فلسفہ عمرانیات اور معاشیات کا مستند علم حاصل ہو سکتا ہے۔ اس سے دین و دنیا کا فرق مٹ جائے گا اور دین و دنیا دونوں کی بھلائی حاصل ہو گی۔ اگر مدارس میں سر دست ان مضامین کی تعلیم کا انتظام نہ ہو تو یہ ممکن ہے کہ مدارس کے طلبہ ان مضامین کی تعلیم یونیورسٹیوں میں حاصل کریں۔ اس طرح علی گڑھ اور دیوبند میں لین دین کا وہ خواب جو گذشتہ صدی میں شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا، پورا ہو جائے گا۔ لیکن شرط یہی ہے کہ انگریزی زبان سے واقفیت ہو ———

کچھ اور مضامین بھی ہیں، مثلاً تاریخ جغرافیہ اور حساب بقدر ضرورت۔ ان مضامین کی ضرورت جتانا عبث ہے۔ صرف اپنا ایک ذاتی تجربہ بیان کروں گا جس زمانہ میں میرا تعلق سیلون یونیورسٹی سے تھا میں نے ایک مدرسہ کے پڑھے ہوئے طالب علم کے داخلہ کی سفارش کی۔ طالب علم میری سفارش لے کر ڈین کے پاس گیا۔ انہیں نہ تو عربی سے سروکار تھا نہ دخل دینے کا شوق۔ طالب علم سے دو باتیں کرنے کی خاطر انہوں نے مکہ مدینہ دجلہ فرات کے جغرافیہ سے متعلق ایک دو سوال کئے۔ جوابات اتنے مایوس کن تھے کہ میرے

لکھے ہوئے کا احترام کرنے کے باوجود انہوں نے اس کا مجھ سے تذکرہ کیا اور مجھے بڑی شرمندگی ہوئی۔ اور حقیقتِ حال سمجھانے میں بڑی دقت ہوئی۔ بہت پہلے مفتی عبدہ نے جامع ازہر کی اصلاح کے سلسلہ میں انہیں باتوں پر زور دیا تھا۔

شاہ ولی اللہ کے بعد سے انیسویں صدی کے وسط تک علماء نے سیاست میں جو بھرپور کردار ادا کیا اُس کی غایت مغربی جمہوریت نہ تھی، بلکہ ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کا کھویا ہوا سیاسی وقار بحال کرنا اور برتری قائم کرنا تھا۔ آج جو علماء سیاست میں حصّہ لے رہے ہیں۔ وہ مغربی جمہوریت اور پارلیمنٹری نظام کے علمبردار ہیں۔ (چند اسلامی شقوں کے ساتھ) جب سے پاکستان میں دستور سازی کا کام شروع ہوا ہے۔ علماء کی تقریریں پارلیمانی نظام کی روایات کے حوالوں سے اسی طرح بھری ہوتی ہیں جس طرح انگریزی تعلیم یافتہ لیڈروں کی تقریریں۔ مغربی جمہوریت کی انگریزی اصطلاحیں بھی علماء کی زبان زد ہوگئی ہیں۔ تو کیا یہ مناسب نہیں کہ مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ مغربی سیاست و جمہوریت کے علم سے لیس ہو کر سیاست کے میدان میں اتریں ——؟

جو اس بات کے لئے تیار نہیں کہ عربی زبان و ادب تفسیر حدیث فقہ کو نصابِ تعلیم میں مرکزی جگہ دیں انہیں حق نہیں پہنچتا کہ علماء کو نصیحت کریں۔ لیکن اگر علماء از خود مدارس کی اصلاح کی سوچیں، جیسا کہ سوچ رہے ہیں۔ تو مذکورہ بالا امور قابلِ توجہ ہیں۔

دیانتداری اور خدمت ہمارا شعار ہے ——!

ہم اپنے ہزاروں کرم فرماؤں کا شکریہ ادا کرتے ہیں

جنہوں نے

پستول مارکہ آٹا

استعمال کر کے —— ہماری —— حوصلہ افزائی کی

نوشہرہ فلور ملز۔ جی ٹی روڈ — نوشہرہ

فون نمبر ۱۲۶